OPEN ACCESS: Al-Aijaz Research Journal of Islamic Studies & Humanities
ISSN (ONLINE): 2707-1219 & ISSN (PRINT): 2707-1200
http://www.arjish.com

ڈاکٹر فاروق عثمان بطور نقاد

Dr. Farooq Usman as Critic

Tanzeela Mushtaq
Ph. D Scholar Department of Urdu BZU, Multan

Dr. Farzna Kokab
Associate Professor, Department of Urdu BZU, Multan

Received on: 08-10-2023 Accepted on: 11-11-2023

Abstract

Criticism is considered as the most important topic of the current era especially in literature. Among the different critic and studies, this study is also important. The present study primarily deals with the great work of Dr. Farooq Usman's. Nukaat e Nazar the work critically evaluates the aspects of culture, prose, poetry, criticism and modernism in literature. This study focuses on practical implication of text the study argues that how Usman's vision and perception for criticism has evolved the ways for the pioneers.

Keywords: Criticism, Literature, perception

موضوع پر گفتگو

تنقید کی روایت جس کا آغاز سر سید احمد خان، حالی اور شبلی سے ہوا۔ وہ اردو ادب میں مختلف زاویوں سے سفر کرتی ہوئی ملتان کے نامور نقاد ڈاکٹر فاروق عثمان تک آپہنچی۔ ڈاکٹر فاروق عثمان تنقیدی رجحانات میں حسن عسکری سے متاثر ہوئے۔ اگرچہ تنقیدی تصورات میں اپنا ایک منفرد کردار اور شناخت بھی بدستور موجود ہے لیکن ان کے نظریات حسن عسکری کے مکتبہ فکر سے متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ خود اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے راقم کو ایک ملاقات میں کہا:۔

"تنقید میں مجھے حسن عسکری نے بہت زیادہ متاثر کیا۔ ان کے ہاں ہمیشہ ایک نئی سوچ ہوتی ہے۔ ایک نئی بات ایک نیا پہلو ہوتا ہے۔"(۱)

ان کی تنقید پر کتاب "نکاتِ نظر"، بیکن بکس ملتان سے ۱۹۹۸ء میں چھپی۔ اس میں کل ۱۵ مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب کا انتساب انہوں نے اپنے مرحوم دوست جابر علی سید کے نام کیا تھا۔ ان کو اپنا دوست اور ایک طرح سے استاد مانتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے نمایاں نقاد ہونے کے باوجود کم لکھا مگر جو کچھ لکھا وہ اعلیٰ پائے کا ہے اور وہ کسی بھی ضخیم کتاب پر بھی حاوی ہے۔ فاروق عثمان کے ہاں نظری اور عملی دونوں طرح کی تنقید پائی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر فاروق عثمان کی کتاب "نکاتِ نظر" جو تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے جو بیکن بکس ملتان نے ۱۹۹۸ء میں شائع کی۔ یہ کتاب ۱۵ مضامین پر مشتمل ہے۔

۱۔ سائنسی شعور ادب اور ثقافت

۲۔ ادب میں جدیدیت کا مفہوم

۳۔ ہم کلامی سے شعور کی رو تک

۴۔ حسابِ دوستاں

۵۔ ہائیکو اور اس کے امکانات

۶۔ عزیز احمد کی ایک کتاب (ترقی پسند ادب)

۷۔ عزیز احمد کا تاریخی افسانہ

۸۔ عزیز احمد کا ایک ناول گریز

۹۔ غلام عباس کا افسانہ۔۔۔ حمام میں

۱۰۔ لاجونتی۔۔۔ ایک تاثر، ایک تجزیہ

۱۱۔ شہر افسوس کی گلیوں میں اپنی جڑوں کا متلاشی

۱۲۔ پانی کا درخت، استعارے کی ایک خوبصورت مثال

۱۳۔ ایک عجیب مغربی ناول

۱۴۔ فہمیدہ ریاض ایک منفرد شاعرہ

۱۵۔ پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا

ان تمام مضامین کا تجزیہ تصدیق کرتا ہے۔ فاروق عثمان نے نظری تنقید اور عملی تنقید دونوں کو اپنایا۔ دونوں کو نقاد کے اوصاف اور ذمہ داریوں میں سے سمجھتے تھے۔ نظری یا اصولی تنقید سے متعلق مضامین کو کتاب کے آغاز میں دیا۔ دیگر مضامین عملی تنقید کے متعلق ہیں کسی ادبی کاوش کو مد نظر رکھ کر تنقیدی اصولوں کا اطلاق کرتے ہوئے اس کے محاسن اور مقام و مرتبہ کا تجزیہ کیا۔

ڈاکٹر فاروق عثمان کی تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب ''نکاتِ نظر'' اس بات کی تائید کرتی ہے۔ وہ شعری تنقید کی بجائے نثری تنقید میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ اس کتاب کے ۱۵ مضامین میں صرف دو مضامین ''ہائیکو اور اس کے امکانات'' اور ''فہمیدہ ریاض ایک منفرد شاعرہ'' براہِ راست شاعری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ باقی سارے نثری اصناف، کتب یا نثر نگاروں سے متعلق ہیں۔ یہ کتاب ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس پر فاروق عثمان نے اپنے قیمتی پندرہ سال صرف کیے۔

ڈاکٹر فاروق عثمان نے اپنے تنقیدی مضامین ''سائنسی شعور ادب اور ثقافت'' کے آغاز میں مذہب اور ثقافت کے درمیان ایک ربط قائم کرنے کی کوشش کی۔ ثقافت اور زندگی کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ وہ کہتے ہیں انسان ان ثقافتی مظاہر اور علامتوں کے حوالے سے

زندگی کے لمس کو اپنی پوروں پر محسوس کرتا ہے۔ان کا خیال ہے کہ ثقافت ایسا آئینہ ہے جو بیک وقت ماضی کا ریکارڈ، حال کا استعارہ اور مستقبل کی امنگوں کا ترجمان ہے۔

''آج مکہ اور کوفہ جدید سہولیات سے مزین فلک بوس عمارتوں کے شہر ہیں لیکن ان کی علامتی حیثیت اپنے پیش نظر سے ماورا ایک ثقافتی صداقت رکھتی ہے۔''(۲)

ڈاکٹر فاروق عثمان کے مطابق ثقافت ہماری رگوں میں خون کی طرح موجود ہیں۔آج بھی کسی مہم پر جاتے ہوئے بلی راستہ کاٹ جائے تو ذات کے اندر شولری کے سارے امکانات ختم ہو سکتے ہیں۔ مگر سائنس کی جدتوں نے عقل سے ماورا چیز کو بے معنی قرار دے دیا۔ڈاکٹر فاروق عثمان اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ سائنسی شعور نے اساطیر اور روایات کو طلسماتی عجائبات کے لیے بے معنی سے مقام سے اٹھا کر احساس کی علامت کے مقام تک پہنچا دیا۔اپنے اس مضمون میں انہوں نے اچھوتے موضوع کا انتخاب کیا اور اپنے وسیع المطالعہ اور استدلالی وصف سے بہت خوبصورت انداز کے ساتھ سائنسی شعور ادب اور ثقافت میں ایک ربط تلاش کرنے کی کوشش کی۔

نظری تنقید کے متعلق ڈاکٹر فاروق عثمان اپنے دوسرے تنقیدی مضمون ''ادب میں جدیدیت''اسے ترقی پسند تحریک سے مختلف تصور ثابت کیا۔جدیدیت کی پہچان کے لیے تین اوصاف کا ذکر کیا۔اول Realism کا ماورائی تصور، دوم ذات کے تشخص کا حوالہ اور سوم وقت کے بارے میں مخصوص رویہ ڈاکٹر فاروق عثمان جدیدیت کے دوسرے پہلو ''ذات کا تشخص کا حوالہ'' کے لیے وہ فرائیڈ اور ژونگ کے تصورات کا ذکر کرتے ہیں۔فرائیڈ کے ذاتی لاشعور اور ژونگ کے اجتماعی لاشعور کے تصورات نے ماضی کے اس تصور کو بے نقاب کر ڈالا ہے۔انسان کی ذات اور نفسیات ماضی کے تاریخی اور نسلی تجربات سے پُر اور بے جان ہوتی ہے۔

ڈاکٹر فاروق عثمان ''وقت'' کو جدیدیت کا تیسرا عنصر قرار دیتے ہیں۔ان کے خیال میں ایک ادیب ٹائم sequence کو توڑنے کے لیے تناسخ کا سہارا لیتا ہے اور تناسخ کی حیثیت عقیدے کی نہیں بلکہ ایک استعارے کی ہوتی ہے جو ذات کی تہوں کے ادراک میں کارگر ثابت ہوتا ہے۔جدیدیت میں ادب کے کردار پر بحث کی۔انیسویں اور بیسویں صدی میں علمی دنیا میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہو رہی تھیں اوعران کے اثرات ہمارے ادب اور ثقافت پر بھی پڑ رہے تھے مگر ہماری ایک منفرد تہذیب اور ثقافت نے بیرونی اثرات کو مکمل طور پر کارگر نہ ہونے دیا مگر ان سیاسی، سماجی، تاریخی اور معاشرتی تبدیلیوں نے جہاں ادب میں تکنیکی اجتہادات کی راہ ہموار کی جن سے ابلاغ کی نئی راہیں کھل گئیں۔ اسلامی ثقافت اور برصغیر کی قدیم ثقافت اور پھر بعد میں مغربی ثقافت کے اثرات سے کلچر کو انڈو مسلم کلچر قرار دیتے ہیں۔انتظار حسین کے افسانے ''خواب اور تقدیر''، عرش صدیقی کے ''چوتھا مجوسی''، رشید احمد کے ''ریزہ شہادت'' اور انوار احمد کے ''کہر اور کہانی'' میں بھی نظر آتے ہیں۔کہانی میں جدیدیت کا ثبوت ہیں۔جدت کے ہی اوصاف اردو ناولوں ''آگ کا دریا''، ''جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں' اس طرح کے دوسرے ناولوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔جدیدیت کے اثرات اردو ادب کے شعراء مثلاً ن۔م۔راشد اور ناصر کاظمی کے ہاں بھی پائے جاتے ہیں مگر جدیدیت کے اوصاف شاعری کی نسبت نثر نگاری میں نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر فاروق عثمان کے مضمون ''ہم کلامی سے شعور کی رو تک'' میں تسلسل خیال، شعور کی رو، تلازمہ خیال اور خود کلامی جیسی اصطلاحات کی وضاحت کی وہ ہنری سے اتفاق کرتے ہیں۔ ''ادائیگی'' کا عمل مصنف کی اپنی چیز ہوتا ہے وہ سب سے زیادہ ذاتی چیز ہے۔ ہم مصنف کو اسی پیمانے سے ناپتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے اظہار کے لیے ''کیوں؟'' اور ''کیسے'' والے سوالات تو کوئی شخص بھی پوچھ سکتا ہے۔ ڈاکٹر فاروق عثمان کے مطابق انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں ایک ایسی لاشعوری قوت سامنے آئی جو انسانی ارادے اور عمل کی آزادی سے اختلاف رکھتی تھی۔ شعور اور لاشعور سے متعلق وہ مغربی مفکرین کی آراء بھی رقم کرتے۔ ولیم کے مطابق شعور کسی ندی کے دھارے کی طرح اپنی رواں دواں اور متغیر ذہنی حالت ہے جس کی سطح پر اور سطح کے نیچے سینکڑوں تصورات اور یاداشوں کے ٹکڑے تیرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ''جوڈ'' عقل اور ادارے کو ہلکی پھلکی رنگین خوبصورت گیندوں کی طرح قرار دیتے ہیں۔ جو ہماری خواہشات اور جبلتوں کی موجوں پر ناچ رہی تھیں۔ ڈاکٹر فاروق عثمان لاشعور کی تین کیفیات کا ذکر کرتے ہیں۔

''اس اسلوب کی بنیاد اس نفسیاتی توجیح پر ہے انسانی ذہن پر مشتمل تجربات اور احساسات کے شہاب ثاقب ذہن کی گہرائیوں میں تحلیل ہو کر گم نہیں جاتے بلکہ Images اور تمثالوں کی شکل میں محفوظ رہتے ہیں۔''(۳)

اردو ادب میں اس ''شعور کی رو'' کو حسن عسکری نے متعارف کروایا اور ان کا افسانہ ''چائے کی پیالی'' اس کی بہترین مثال ہے۔ ڈاکٹر فاروق عثمان نے ڈورتھی رچرڈس (ان کے ناول pilgrimage کو انگریزی ادب کا اس تکنیک کا پہلا ناول سمجھا جاتا ہے) وائس اور جیناوولف کو ''شعور کی رو' کے نمائندہ ناول نگار قرار دیا ہے۔ دیگر خصائص کو وہ صحرا کی دھوپ میں سرد ہوا کا جھونکا محسوس کرتے ہیں۔ اس میں پہلی صورت کہانی نگار کا قدیم فطری اور اسطوری علامات کا استعمال کرنا اور دوسری صورت تاریخی شعور ہونا زندگی صرف ایک خاص وقت میں نہیں گزرتی۔ وہ اپنے مضمون کا اختتام ٹی ایس ایلیٹ کی اس خوبصورت بات پر کرتے ہیں کہ فن اگر اپنی تفہیم کے لیے علم کا تقاضا کرے تو اس سے محبت کا اظہار کرنے والوں کو اس کے مثبت جواب کے لیے تیار ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر فاروق عثمان نے اپنے تنقیدی مضمون ''حساب دوستان'' میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے لے کر ۱۹۳۵ء تک اور ان کے بعد تحریک آزادی تقسیم ہند جیسے اہم سیاسی واقعات اور ادبی شعور اور تصورات کا جائزہ پیش کیا۔ یہاں کے ادیب پر قومی اور ملی سیاسی اور مذہبی تناظر کی ذمہ داریاں عائد تھیں۔ ۳۶۔۱۹۳۵ء کے قریب ادیب کے تصورات میں ایک تبدیلی آنا شروع ہو گئی۔ غلامی کے اصل اسباب عام لوگوں تک پہنچانے میں ناکام رہا ہے۔ بقول فاروق عثمان ادیب کو سماجی اور سیاسی مسائل کی بجائے اپنے ارد گرد ''بحر العقول'' واقعات دکھائی دینے لگے۔ اسی دور میں برصغیر کے مسلمان اپنی معاشی محرومیوں کے کرب کی وجوہات بھی اپنی گم شدہ میراث میں تلاش کرتے نظر آئے۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کے مشکل کے ادوار میں اعلیٰ معیار کا وطنیت کی حدت سے بھرپور ادب تو تخلیق ہوا مگر ایسی یادداشتیں یا ہنگامی ادب ایک حقیقی فن پارے جتنی اہمیت حاصل نہیں کر سکتا۔ ہمارا ملک نسلی یا لسانی بنیادوں پر نہیں بلکہ ایک تصور کی بنیاد پر قائم ہوا اور خطے کا تمدن برصغیر کی تمدنی وحدت سے مختلف ہے۔ ہمارے ادیب کو بھی اس حقیقت کے پس منظر میں خود کو Integrate کرنا ہوگا ورنہ ادب آفاقیت کا مقام حاصل

نہیں کر سکتا۔ صرف ایک ذاتی رائے یا تاثر بن کر رہ جائے گا۔

ڈاکٹر فاروق عثمان اپنے تنقیدی مضمون ''ہائیکو اور اس کے امکانات'' کے آغاز میں حسن عسکری کا ایک جملہ رقم بند کرتے ہیں۔ ادیب کا مقصد صرف چونکا دینا ہی نہیں اس سے بڑھ کر ہے۔ ادیب کی طرف سے دو مخصوص رویوں، لفظ کے خلاف متشددانہ رویہ اور ہیئتوں کی درآمد کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ ان کے ہاں ہیئت کی درآمد کے لیے پسندیدگی نظر نہیں آتی۔

ڈاکٹر فاروق عثمان لکھتے ہیں کہ ۱۹۶۳ء میں جاپان میں دوبارہ بادشاہت کی بحالی کے ساتھ جدیدیت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے اثرات ادب پر بھی رونما ہوئے ہوں گے مگر جاپان کے بعد جدید کے نامور شعرا ماساکا سکی اور خاص طور پر تاکایام کیوشی کی رائے ہے۔ ہائیکو بنیادی طور پر ایک روایتی کردار کی حامل صنفِ سخن ہے۔

ڈاکٹر فاروق عثمان کے خیال میں مغربی اصناف سخن یا درآمدی ہیئتوں کے اردو زبان میں تجربات اکثر ناکام نہیں رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ''سائنٹ'' اور ''ترائیلے'' کی مثال دیتے ہیں۔ اختر شیرانی، احمد ندیم قاسمی اور ن م راشد جیسے شعراء نے اردو میں متعارف کرانے کی کوششیں کیں مگر کامیاب نہ ہو سکیں۔ سپنگلر کی بات کا حوالہ دیتے ہیں ''ہر معاشرہ اپنی مخصوص فنی اوصاف رکھتا ہے جنہیں صرف معاشرے کے اندر رہ کر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ ایڈرا پاؤنڈ نے Supen positoryکہا اسی اسلوب پر ہی ہائیکو لکھی۔

ڈاکٹر فاروق عثمان کے تنقیدی مضمون ''عزیز احمد کی ایک کتاب (ترقی پسند ادب)'' میں اس کتاب کا تجزیہ پیش کیا۔ ۱۹۴۵ء میں عزیز احمد کا تہذیبی مطالعہ اتنا وسیع نہ تھا۔ فن پاروں میں بعد والے عرصے میں نظر آتا ہے۔ وہ تنقید کے فہم خوب واقفیت رکھتے تھے۔ ترقی پسند تحریک کے نظریات کے حق میں نہیں اور اپنے مضمون میں ترقی پسند تحریک کے الفاظ زیادہ استعمال نہیں کرتے۔ اس کی بجائے ''تحریکی ذہن'' تحریکی فکر اور انقلابی قدروں جیسی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ تحریک کا یہ طرز عمل رہا مختلف ادیبوں کی اس تحریک کے ساتھ وابستگی یا اس سے اخراج کے حوالے سے کافی عجلت سے کام لیا۔ اس میں ناقدین غیر سنجیدگی کا عمل دخل بھی ہے۔ عزیز احمد کی کسی بھی دور میں اس تحریک کے ساتھ ہم آہنگی نہیں رہی۔ ترقی پسند ادب کے نام سے عزیز احمد کی کتاب اولین کتاب ہے۔

۔ عزیز احمد کا کہنا ہے کہ کلاسیکی شاعری طبعی (Physical) زندگی کو اہمیت نہیں دیتی۔ حقیقت کے قریب جب بھی آنا چاہتی ہے تو مابعد الطبعیاتی حقیت کی طرف رُخ کر لیتی ہے۔ اس میں رمزیت زیادہ اور اشیاء ماحول اور اجسام کا ذکر کم جنسی مسائل سے متعلق ترقی پسند تحریک کا مؤقف نامکمل ہے۔ اس تحریک میں جنسی مسائل کے اسباب تو بیان کیے مگر جنسی موضوعات کے اظہار کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ اس تحریک کے حامی اور ذمہ دار لوگ ہندوستان کے متوسط اور نچلے طبقے کے افراد کی طرف سے ممکنہ مخالفت سے بچنے کے لیے جنسی موضوعات کا اظہار کی ایک بنیادی سچائی سے آنکھیں چراتے رہے۔ عزیز احمد لکھتے ہیں ''انگارے'' کی تنقید میں کہ اس کا سب سے بڑا نقص احتیاط کا فقدان، بے اصولی اور انتہا پسندی تھی۔

ڈاکٹر فاروق عثمان تنقیدی مضمون ''عزیز احمد کا تاریخی افسانہ'' میں تاریخی افسانہ نگاری کی روایت کے مباحث بیان کیے۔ مختلف افسانے ادیبوں

نے دیگر موضوعات جیسے سماجی حقیقت نگاری پر بہت کام کیا مگر تاریخی کہانی کی طرف توجہ نہ دی۔ اول کہانی میں حقیقت گناری کے سبب افسانہ نگار نے اس حال سے ہی مربوط کیا اور ماضی میں حدود محسوس کیں۔ دوم تاریخی افسانہ نکو نظریاتی اور تبلیغی مقاصد کے حصول کے لیے موزوں سمجھا گیا مگر اس رویے سے دو مسائل پیدا ہوئے۔ اول یہ کہ کہانی آزادانہ طور پر ارتقاء کی منازل طے ہ کر سکی اور دوسرا یہ کہ مخصوص تبلیغی مقاصد سے معروضی تجزیہ کاری کی موت واقع ہو گئی۔ تاریخی کرداروں کے تناظر میں لکھتے ہیں:۔

''تاریخی کردار ہماری نظر میں یا تو بدی کی علامت ہے یا اچھائی کی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''(۴)

ڈاکٹر فاروق عثمان عزیز احمد کے دو تاریخی افسانوں ''خدنگ جستہ'' اور ''جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں'' کا تجزیہ پیش کیا۔ دونوں افسانوں کا پس منظر امیر تیمور گورگاں اور اس کی بیوی ''اولجائی'' کی زندگی کا ہے۔ امیر تیمور ریاستی آزادی کی جدوجہد میں معروف تھا۔ یہ افسانے عزیز احمد نے روایتی تاریخی انداز میں نہیں لکھے۔ ''خدنگ جستہ'' میں تیمور کی نسبت اس کی بیوی ''اولجائی'' کا کردار باطنی حسن اور فنی لطافتوں کی وجہ سے زیادہ معتبر نظر آتا ہے۔ تیمور کے ''چنگیز'' بن جانے کے امکانات موجود ہیں۔ داخلی حسن اور معاشرتی ضرورت کی بنا پر آفاقی کردار نبھانا چاہتی ہے۔ عورت کی حیثیت سے فاروق عثمان لکھتے ہیں:۔

''نظم کائنات میں عورت کی حیثیت خلاقانہ ہے وہ اپنی روح اور جسم کو پارہ پارہ کرتے بھی تخلیق کا فریضہ ادا کرتی ہے اسی میں اس کے لیے ایک مسرت ہے ایسی مسرت کہ جس کا نعم البدل کوئی دوسری سماجی مرتبہ یا خارجی اقتدار نہیں ہو سکتا۔''(۵)

ڈاکٹر فاروق عثمان عزیز احمد کے دوسرے افسانہ ''جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں'' کا تجزیہ کیا۔ اس افسانے کو تیمور جہاں سوز اور تیمور جہاں ساز درمیان ایک کش مکش قرار دیتے ہیں جس میں تیمور جہاں سوز کو سبقت حاصل ہوئی۔ اگر اعلیٰ اخلاقی اقدار کو ذاتی جاہ و حشمت اور خوف فطرت پر ترجیح نہ دی جائے تو مناظر خون آلود اور شہر بربادی کا منظر پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فاروق عثمان ای ایم فاسٹر کی فکشن سے متعلق دو سطحوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ Lift in time اور Life in values عزیز احمد کے تاریخی افسانوں میں وقت کی حدود کو توڑ کر کائناتی اصولوں کو اپنایا گیا۔ ''جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں'' میں اساطیر، روایات اور لی جنڈ کے امتزاج سے اسلوب پیش کیا۔

ڈاکٹر فاروق عثمان نے غلام عباس کے افسانہ ''حمام میں'' پر ایک تنقیدی مضمون لکھا۔ غلام عباس کو اپنے افسانوں ''تکیہ''، ''اوورکوٹ''، ''بیلی''، ''آنندی'' اور ''بندر والا'' سے کافی شہرت ملی لیکن افسانہ ''حمام میں'' ایک شریر بچے کی مانند عزیز اور پسندیدہ گردانتے ہیں۔ افسانہ ''حمام میں'' مرکزی کردار فرخ اور بھابھی ہیں۔ کلچرل لیڈی ہونے کی وجہ سے ہر شام ان کے مکان پر ایک محفل سجتی ہے جس میں نام نہاد دانش اور ادبی، مذہبی، سیاسی موضوعات پر دیر تک بے فائدہ گفتگو میں مشغول رہتے ہیں۔ ان کی روزی کا واحد ذریعہ ''سلائی مشین'' چوری ہو جاتی ہے اور اس کی محفل کے لوگ زبانی ہمدردی اور دعوے کرتے ہیں۔ اس محفل میں ''میر صاحب'' کی آمد فرخ بھابھی کے لیے تحائف بھی لاتا ہے اور دانش مندانہ گفتگو بھی کرتا ہے کچھ دن بعد ''میر صاحب'' اور فرخ بھابھی ایک محفل سے غیر حاضر ہوتے ہیں پھر فرخ بھابھی ایک محفل سے غیر حاضر ہوتے ہیں۔ پھر فرخ بھابھی کی آمد اور آتے ہی نہاتے ہیں۔ معروف ہو جانا محفل کے حاضرین کے لیے مشکوک و

شبہات پیدا کر دیتا ہے۔

یہ افسانہ طنز ہے ان دوستوں پر جو ظاہری طور پر بہت باتیں اور ہمدردیاں کرتے ہیں عملاً بے فائدہ اور بے کار ہیں۔ مگر صداقت کم ہوتی ہے کیونکہ سب منصوبوں کے پیچھے خوشامد، وقت گزاری اور منافقت کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ ایسے لوگ خود فریبی اور اپنی ذات سے نظریں چرا کے جی رہے ہوتے ہیں۔ انہیں تعمیری اور عملی جستجو اور افعال کا نہ تجربہ ہوتا ہے اور نہ احساس، بھلا یہ کیسے ممکن ہے لوگ اپنی روحوں کو تو دیکھ نہ سکیں وہ دوسروں کی روحوں کو کسی طرح جگمگا کے روشن کر سکتے ہیں۔ ان کے دوستوں کا کھوکھلا پن کا ادراک فرخ بھابھی کو اس وقت ہوتا ہے جب اس کی سلائی مشین چوری ہوتی ہے اور کوئی بھی دوست اس کی مدد کے لیے تیار نہیں ہوتا وہ خود کو ایک اجنبی تصور کرتی ہے۔ اس وقت اس کی جو کیفیت اور جذبات ہیں۔

ڈاکٹر فاروق عثمان کے ایک تنقیدی مضمون ''لاجونتی'' جو راجندر سنگھ بیدی کا ہے کا جائزہ لیا۔ تقسیم ہند کے وقت کے ''فسادات'' اردو ادب اور خاص طور پر نثری ادب کا ایک نمایاں موضوع رہے۔ وہ ادیب جنہوں نے اس موضوع پر واضح اثر کے ساتھ رکھا۔ ان میں سے ایک نام راجندر سنگھ بیدی کا بھی ہے۔ کہانی کی تہہ میں وہی فسادات کا پس منظر ہے مگر ساتھ ''لاجونتی'' کے کردار کی مدد سے بیدی نے اپنی ذات کا عکس بھی ظاہر کیا ہے۔ یہ ایک نسوانی کردار ہے مگر اس کے اوصاف، اس کی فطرت اور اس کے کردار میں جا بجا بیدی کی اپنی شخصیت اور مزاج کی جھلک سامنے آتی ہے جو لوگ ان کو شفیق اور ہمدرد سمجھتے تھے۔ وہ بھی ان کے رویے میں ''فسادات'' کے بعد آنے والی تلخیوں کو محسوس کرنے لگے تھے مگر ''لاجونتی'' میں انہوں نے اپنی شخصیت کا اظہار اس طرح کیا لاجونتی اپنی کہانی ہے جس میں ''سندر لال'' ایک شوہر ہے اور لاجونتی بیوی سندر لال لوگوں کا نمائندہ بننے اور سماج سہار مرد بننے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی مردانگی کی صفات اور مرتبہ بھول جاتا ہے۔ وہ طرح طرح کے پروگرام پھر بساؤ۔۔۔ دل میں بساؤ۔۔۔ وغیرہ کامیاب کرنے کی کوشش میں معروف عمل رہا۔ لاجونتی کے لیے اس کا طرزِ عمل گھاؤ دینے اور نشتر رہا اس کا داخلی طور پر خون میں لت پت ہونا ضروری عمل تھا۔

ڈاکٹر فاروق عثمان نے کہانی میں کرداروں کے داخلی کیفیت اور تعینات کا جائزہ لیا اور بیدی کے تصور کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ سندر لال کی تعینات اور داخلی کش مکش کو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ لاجونتی کو دیوی بنائے بیٹھا ہے اور اس کے گھر آنے پر بہت خوش ہے اور وہ اپنے اندر ماضی کے رویے اور باطن کے خوف کے سانپ بھی خوف زدہ ہے۔ ڈاکٹر فاروق عثمان نے مضمون کے آخر میں بیدی کی عمومی تکنیک اور لاجونتی کے حوالے سے بڑا موثر اختتام پیش کیا ہے:۔

''جہاں تک تکنیک کا تعلق ہے اس سلسلے میں تو کوئی کلام نہیں بیدی کی تکنیک بڑی کی کسائی ہوئی ہے۔۔۔ منٹو کی گھاتن کی طرح۔۔۔ بیدی کی کہانیوں میں ہندو دیومالا اور اساطیر کے واقعات سے کہانی کی معنویت اور باطنی سطح کو سہارا دینے کا عمل تسلسل کے ساتھ ملتا ہے۔ آزادی کے بعد اس طریقہ کار میں بھی زیادہ کا احساس ہوتا ہے جو کہیں تصنع کو چھو لیتی ہے۔ کسی اقلیتی مجبوری کے تحت تو ایسا نہیں ہو رہا تھا؟۔۔۔ بات سوچنے کی ہے۔ لاجونتی اس ''بعد کے'' کے دور میں پہلے کی کہانی ہے اس لیے یہ عمل حدوں کے اندر رہتے ہوئے معنی کی توسیع کا سبب بنتا

ہے۔"(٦)

ڈاکٹر فاروق عثمان کا تنقیدی مضمون "شہر افسوس کی گلیوں میں اپنی جڑوں کا متلاشی" میں اردو ادب کی نامور شخصیت انتظار حسین کے افسانوی موضوعات کا جائزہ لیا۔ اس مضمون میں امریکی خاتون افسانہ نگار کی بات سے آغاز کیا جس کا کہنا ہے کہ افسانے آسمان پر موجود تاروں کی طرح ہیں جن میں سے کچھ دائروں کی طرح، کچھ شہاب ثاقب کی مانند اور کچھ اچانک شعلہ زن ہونے والے خاتون کی رائے اردو افسانے پر بھی صادق آتی ہے۔ وہ بھی اتنے ہی تنوع کا حامل ہے۔ وہ افسانے کو کسی بھی معاشرے کی تہذیب کا عکس سمجھتے ہیں۔ افسانے نے معاشرتی، سیاسی، معاشی یا نفسیاتی تمام حالات واثرات کو پیش کیا۔ اس کے ہر سفر کے دوران کئی مراحل سامنے آئے اہم مرحلہ تقسیم کے دوران شروع ہونے والے فسادات کا ہے۔ افسانوں میں فسادات اہم موضوع رہا ہے۔ انسانیت پر ہونے والے مظالم کا تذکرہ ہمیں مختلف افسانوں میں ملا جہاں انسان ایک کٹی پتنگ کی مانند حالات کی ہواؤں کے تھپیڑے کھاتا ہوا کبھی ایک طرف تو کبھی دوسری طرف دھکیلا جاتا جس شخص نے موجودہ انسانی کیفیت کو بھرپور انداز میں پیش کیا۔ وہ انتظار حسین ہیں:۔

ڈاکٹر فاروق عثمان نے انتظار حسین کے اقداری ذات اور مقداری ذات کے تصورات سے زندگی کی ڈومین کو بیان کیا۔ انہوں نے آج کے معاشرے کے بگڑے ہوئے چہرے کو قابل تضحیک سمجھاتا۔

ڈاکٹر فاروق عثمان کا کہنا ہے کہ شعر وادب میں تشبیہ اور استعارے کا استعمال جن کو بڑھانے اور تاثرات کو اجاگر کرنے کے لیے ہمیشہ ہی اور ادیب اپنی تحریروں میں استعمال کرتے چلے آتے ہیں۔ کرشن چندر نے اپنے افسانے "پانی کا درخت" میں واقعی استعارے کی ایک خوبصورت مثال پیش کی ہے۔ زندگی کے حسن اور تابناکی کے لیے مادی آسائشوں کا ہونا ضروری ہے۔ انہیں ہمہ قسم آسائشوں کے لیے پانی کو استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اسی حوالے سے ڈاکٹر فاروق عثمان کا کہنا ہے:۔

"تجربات کبھی بھی براہِ راست اظہار نہیں پاتے کوئی نہ کوئی خارجی چیز ان کی قائم مقام بنتی ہے۔ تجربات اور خارج کی اشیا کے درمیان مناسبت کی تلاش ہی دراصل استعارے کو وجود عطا کرتی ہے۔"(٧)

دیگر افسانہ نگاروں نے ایسے استعاروں کا استعمال کی انسانی احساس اور جذبے کی صورت میں کیا۔ بیدی کے افسانہ "گرہن" میں "چاند گرہن" ایک انسانی احساس کی صورت اختیار کر لیا ہے۔ ڈاکٹر فاروق عثمان نے "پانی کا درخت" کے خوب صورت استعارے کو اس طرح متعارف کروایا۔ اپنے تنقیدی مضمون "پانی کا درخت" استعارے کی خوبصورت مثال ہے۔

ڈاکٹر فاروق عثمان اپنے تنقیدی مضمون کا آغاز شعری تنقید کے حوالے سے "فہمیدہ ریاض۔ ایک منفرد شاعرہ" کے عنوان سے کیا۔ وہ دو طرح کے انسانوں کو متعارف کرواتے ہیں جس کا زندگی اور جذبات کی صداقتوں کے حوالے سے رویہ ایک دوسرے بالکل مختلف ہے۔

"دل کے نہاں خانوں میں بننے والی تصویریں جذباتی صداقتوں کی آئینہ دار ہوتی ہیں اور جب جذباتی صداقتوں کو انسان معاشرے کے عطا کردہ سانچوں میں ڈھلی ہوئی فکر کے تناظر میں دیکھتا ہے تو یا تو آنکھوں پر ٹھیکری رکھ کر ان کا انکاری ہو جائے اور یوں منافقین کے گروہ میں شامل

ہوتا ہے یا پھر اقرار کر کے اپنی صلیب بخوشی اپنے کاندھے پر اٹھالیتا ہے۔"(۸)

دو طرح کے انسانوں میں سے فہمیدہ ریاض کو دوسرے گروہ سے منسلک کرتے ہیں جو زندگی کی تمام صداقتوں کو کھلے دل تسلیم کرتی ہے چاہے جذباتی پیاس ہو یا جنسی جذبے کی تکمیل۔ وہ ایسی منفرد شاعرہ ہیں جو اس مشکل انتخاب سے آنے والی مشکلات سے گھبراتی بھی نہیں بلکہ اس کے لیے ہر وقت اعتراف کرنے کے لیے تیار ہے۔ فہمیدہ ریاض کے دو مجموعے "پتھر کی زبان" اور "بدن دریدہ" کے حوالے سے ان کا کہنا ہے۔ اس میں سیدھی سادھی سچائی ہے جو انسان کے وجود سے متعلقہ ہیں۔

ڈاکٹر فاروق عثمان کے مطابق فہمیدہ ریاض کی شاعری جذبات اور احساسات کے اظہار کی منزل پر نہیں رکتی بلکہ ان کے لاشعور میں جنم لیتا ہے جسے وہ اپنے زمانی اور تاریخی تسلسل میں قبول کرتی ہے۔ چونکہ جنس بھی حیاتی عمل ہے اس کو وجود سے الگ نہیں کیا جاسکتا بلکہ انسانی وجود کی مانند اس کے ساتھ منسلک رہ کر نمو پاتا ہے۔ جنسی جذبات سے متعلق خیالات تو تقریباً ہر شاعر اور شاعرہ کے ہاں ہی ملتے ہیں۔ فہمیدہ کے نسوانی حیثیت اور پھر ہماری معاشرتی اقتدار کی وجہ سے ان کی زبان سے ایسے جذبات کا اظہار اسے سنسنی خیز بنا دیتا ہے وگرنہ اگر اسے حیاتیاتی تخلیق کے تناظر سے دیکھا جائے تو حیرت کی بات نہیں۔ ہمارے معاشرے میں عورت کو حیاتیاتی وجود کی بجائے اس کو بہن، بیٹی اور بیوی کے روپ میں ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کے وجودی حقائق سے آنکھیں پھیر لی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر فاروق عثمان کے خیال میں فہمیدہ ریاض معاشرے کی قدغنوں اور رسومات کی بنا پر وجود کو مصنوعی حسن عطا کرنے کی منافقت تصور کرتی ہیں۔ وہ اس کے حقیقی وجود اور صداقتوں کے اعتراف کے حق میں ہے۔ ڈاکٹر فاروق عثمان کے مطابق جنسی جذبے کی خاطر وجود ثانی کی موجودگی یا غیر موجودگی اہم سوال ہے۔ فہمیدہ ریاض کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

"جنسی جذبے کو وجود شناسی کا ذریعہ تصور کرنا ایک لحاظ سے فردیت ہندی کی مخالف سمت چلنا ہے جنسی تجربے سے مکمل آشنائی فریق ثانی کی موجودگی کے بغیر نہیں ہو سکتی اگر ہوتی ہے تو ادھورے پن اور سستی لذتیت سے آگے نہیں بڑھتی۔ وجودیت کے فلسفے کا ایسا خلا ہے کہ آج کے دور کا سب سے بڑا وجودیت پسند ادیب اور ناول نگار سارتر بھی اس معاملے میں کھل کر بات کرنے سے گریز کرتا ہے۔"(۹)

ڈاکٹر فاروق عثمان کا تنقیدی مضمون "پھر باتیں نہ ایسی سنیے گا" ان کے ادبی رفیق جابر علی سید سے متعلق ہے جس نام انہوں نے اپنی کتاب کا انتساب کیا۔ اس میں جابر علی سید کی شخصیت، ان کا فن اور ادب شناسی کے حوالے سے بڑی بات ہوئی ان کا تعلق ڈاکٹر فاروق عثمان کے شہر ملتان سے تھا پسندیدہ میدان فکشن تھا اور انہوں نے بیسویں صدی کی تیسری چوتھی اور پانچویں دہائی کے افسانوں اور ناولوں کو اتنی دلچسپی اور باریک بینی سے پڑھا تھا۔ ان کے نام انگلیوں پر گنوا دینے کی اہلیت رکھتے تھے۔

ڈاکٹر فاروق عثمان کے مطابق جابر علی سید نامور ادیب عزیز احمد سے لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کے ناول سے خصوصی محبت خاص ثبوت ہے بلکہ ان کی وفات پر ایک نثری نوحہ لکھا۔ اور ابنِ فرید نے ان کی ترجمہ کی گئی بوطیقا پر جب اعتراضات اٹھائے تو جابر علی سید نے ان کے وجوابات کے لیے ایک مضمون بھی تحریر کیا۔ ان کی ایک خوبی تھی کہ ہنری جیمز کی طرح وہ بہت سے ناولوں اور افسانوں ہر تنقیدی تبصرہ کرتے ہوئے چند

جملے ادا کرنے کے بعد خاموش ہو جاتا کرتے تھے اور جیمز کی طرح وہ تنقید میں بہت احتیاط برتتے تھے ان کو اچھی کتب سے اس حد تک لگاؤ ہوتا تھا جیسے کسی محبوب سے محبت۔۔۔۔۔ جابر علی سید ان ناقدین جن میں محمد حسین آزاد، شبلی، حالی، احتشام، بجنوری، سکینہ، خورشید الاسلام، یوسف حسین خان اور فراق کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے کسی خاص مکتبہ فکر سے خصوصی میلان نہ تھا۔ جابر علی سید غزل کو ثقافتی رویوں کی آئینہ دار سمجھتے ہیں۔ فنی جمالیات کا مظہر وہ نظم کو سمجھتے مگر مختصر نظم کو پسند نہیں کرتے تھے۔ راشد اور میرا جی کو پسند کرتے تھے وہ شاعری میں ہندی الفاظ کو پسند نہیں کرتے وہ ملتان کے شعراء میں سے اسلم انصاری کو زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان سے لگاؤ کی ایک وجہ ''فارسیت'' بھی تھی۔ وہ مغربی ادب کے علمِ عروض، علم قوافی اور علم بیان سے ان کی دلچسپی تاحیات کبھی کم نہ ہوئی۔

Reference

1. Rakim Al-Haruf meeting with Dr. Farooq Usman, at his residence, Shalimar Colony, Multan, on 15 August 2011.
2. Rakim Al Haruf meeting with Professor Najeeb Jamal, at the Dean's Office, The Islamia University, Bahawalpur, on August 18, 2011.
3. Ibid, p.35
4. Ibid, p.53
5. Ibid, p.57
6. Ibid, p.106
7. Ibid, p.107
8. Ibid, p.109
9. Ibid, p.111

.